حجازِ مقدس کی والہانہ حاضری

حضرت مولانا عبدالرؤف غزنوی
سابق استاذ: دارالعلوم دیوبند انڈیا، حال استاذ: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

(پانچویں قسط)

حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ سے استفادہ کا موقع اور اُن کا تذکرۂ خیر

اس سے پہلے یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ''**جامعة الملک سعود ریاض**'' میں احقر کے داخلہ لینے کے چار بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد فضیلۃ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ الحلبی الشامی الحنفی قدّس سرّہٗ سے خصوصی طور پر استفادہ کرنا تھا، شیخ کا ذکرِ خیر احقر نے پہلی بار دارالعلوم دیوبند میں اپنے استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم سے اس وقت سنا تھا' جب میں دورۂ حدیث کا طالبِ علم تھا، حضرت مفتی صاحب وقتاً فوقتاً دورانِ سبق ان کا ذکر خیر اور اُن کی تصانیف کا حوالہ دیا کرتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ ایک زبردست محدّث وفقیہ اور حنفی المذہب عالم ہیں اور ہمارے اکابرین کے بے حد معتقد ہیں، دارالعلوم دیوبند سے گہری محبت رکھتے ہیں اور دارالعلوم تشریف بھی لاچکے ہیں۔

فراغت کے بعد جب اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں احقر کا تقرُّر رہا تو اس وقت شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور ان کے علمی مقام سے مزید آگاہی ہوئی اور حضرت علاّمہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''**التصریح بما تواتر فی نزول المسیح**'' اور حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ''**مقدّمة إعلاء السنن**''، اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''**الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل**'' اور ان کی دوسری کتاب ''**الأجوبة الفاضلة**'' پر شیخ کی بے نظیر تحقیق وتعلیق اور دارالعلوم دیوبند اور ہمارے اکابرین سے متعلق ان کے عقیدت مندانہ تاثرات کا انکشاف بھی ہوا، لہٰذا غائبانہ طور پر ان سے محبت وعقیدت پیدا ہوگئی اور یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ''**جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامیة ریاض**'' میں استاذ ہیں، مذکورہ جامعہ میں داخلہ لینے کی صورت نہیں بن رہی تھی، البتہ ''**جامعة الملک سعود ریاض**'' میں داخلہ کی صورت بن گئی اور اس بہانے شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ سے

ملاقات اور ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضری کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہونے کی امید پیدا ہوگئی۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی ملاقات

جب احقر کا داخلہ ''جامعة الملک سعود ریاض '' میں ہوگیا اور ۳۰ محرم ۱۴۰۸ھ کو ریاض پہنچ کر مذکورہ جامعہ میں مقیم ہوگیا، تو بالکل ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ جامعہ کے قریب کتابوں کی ایک عالمی نمائش لگی ہوئی ہے، جس میں مختلف قسم کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ راقم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک دن مغرب وعشاء کے درمیان اس نمائش میں پہنچ گیا اور کتابوں کی تلاش میں مصروف ہوگیا، اُسی دوران ایک سفید ریش سرخ وسفید نورانی چہرہ والے ایسے شخص کو لگن کے ساتھ کتابوں کو تلاش کرتے ہوئے میں نے دیکھا جن کے چہرے سے علم وتقویٰ، خوش اخلاقی واخلاص اور ہمدردی ودیانت داری کے جلوے پھوٹ رہے تھے، ایک ساتھی نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جانتا تو نہیں، لیکن ان کا چہرہ یہ بتارہا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی صلاحیت وتقویٰ کے مالک شخص ہوں گے، ساتھی نے کہا کہ: یہ مشہور ومعروف حنفی عالمِ دین شیخ عبدالفتاح اَبوغدّہ ہیں، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور فوراً آگے بڑھا اور ادب واحترام کے ساتھ سلام کرکے ان سے مصافحہ ومعانقہ کیا اور مزاج پرسی کی، شیخ نے بھی بہت ہی شفقت ومحبت کے انداز میں خیریت معلوم کرکے مجھے اپنا تعارف کرانے کا حکم دیا، میں نے اپنا نام اور ''جامعة الملک سعود '' میں حال ہی میں داخلہ لینے کا ذکر کیا، ساتھیوں نے دارالعلوم دیوبند سے میری تدریسی وابستگی کا ذکر بھی کردیا، جس سے وہ بے حد خوش ہوئے اور دارالعلوم دیوبند اور اس کے مشائخ وطلبہ کے حالات معلوم کیے اور فرمایا کہ: دارالعلوم دیوبند تو ایک ایسا دینی مرکز ہے جس نے ہزاروں علماء، مفکّرین، مصنّفین اور مجاہدین پیدا کیے، پھر دارالعلوم کے چند مخصوص ان اساتذۂ کرام کے حالات معلوم کیے جن کو شیخ ذاتی طور پر جانتے تھے اور ہندوستان کے چند دیگر علماء کے حالات بھی دریافت کیے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ اچانک ملاقات احقر کے لیے باعثِ خوشی اور ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی، جس نے کتابوں کی نمائش میں جانے کا اصل مقصد بھلا دیا اور دل یہ چاہ رہا تھا کہ ان خوشگوار لمحات کا دورانیہ طویل ہو! لیکن نمازِ عشاء کا وقت قریب آگیا اور ہم سب لوگ مسجد کی طرف روانہ ہوگئے اور مختصر وقت میں یہ پہلی اور دلچسپ ملاقات اگرچہ اپنے اختتام کو پہنچی، تاہم اس نے شیخ کی محبت وعقیدت میں اضافہ کردیا اور اس ارادے کو بھی مضبوط بنادیا کہ ریاض میں موجودگی کے دوران شیخ سے ان شاء اللہ تعالیٰ! استفادہ کی کوشش ضرور کروں گا۔

شیخ عبدالفتاح ابوغُدّہؒ کی ''جامعة الملک سعود'' منتقلی اور احقر کے لیے استفادہ کا ایک نادر موقع

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ شیخ ابوغُدّہ ''جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامیة ریاض ''

کے استاذ تھے اور میرا داخلہ ''جامعة الملک سعود ریاض '' میں ہوا تھا، اور یہ دونوں الگ الگ مستقل علمی ادارے ہیں اور ریاض شہر کے اندر دونوں کا محل وقوع بھی جدا جدا ہے، اس لیے شیخ سے استفادہ میں دشواری تھی، کیونکہ نہ تو میرے پاس کوئی ذاتی سواری تھی اور نہ وقت میں اتنی گنجائش تھی کہ میں روزانہ ''جامعة الملک سعود '' کے اوقاتِ درس میں بھی حاضر رہوں اور پھر ''جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية '' جا کر شیخ کی خدمت میں بھی حاضری دیا کروں، لہٰذا اس پر غور کر رہا تھا کہ ہفتہ وار چھٹیوں (جمعرات اور جمعہ) اور اسی طرح دیگر چھٹیوں میں شیخ سے استفادہ کی کوئی ترتیب بناؤں گا۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میرے داخلہ کو ابھی مختصر ہی عرصہ ہوا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ ''جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية '' سے ''جامعة الملک سعود '' منتقل ہو رہے ہیں، جہاں ''کلية التربية '' کے آخری سال کے طلبہ اور دراساتِ علیا کے طلبہ کو علومِ حدیث پڑھائیں گے، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، اس لیے کہ اس صورت میں شیخ سے استفادہ کی میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو جاتی۔

''جامعة الملک سعود '' میں میرا داخلہ شعبہ ''معهد اللغة العربية '' میں ہوا تھا اور شیخ شعبہ ''الثقافة الإسلامية، كلية التربية '' میں پڑھانے لگے، لہٰذا باضابطہ طور پر تو میرا کوئی سبق ان کے پاس نہیں تھا، لیکن حسنِ اتفاق سے ''معهد اللغة العربية '' میں میرے اسباق صبح کے وقت ہوتے تھے اور شیخ ''کلية التربية '' میں شام کے وقت علوم الحدیث پڑھاتے تھے، میں نے شیخ سے ان کے گھنٹے میں سامع کی حیثیت سے شرکت کی اجازت طلب کی، انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ درخواست منظور فرمالی، اسی طرح میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ ''کلية التربية '' میں واقع ان کے دفتر میں فارغ اور مناسب وقت میں استفادہ کے لیے مجھے حاضری کی اجازت مرحمت فرمائیں! انہوں نے یہ درخواست بھی منظور فرمالی، چنانچہ احقر کی ایک خوش قسمتی یہ رہی کہ شام کے وقت شیخ کے ایک گھنٹے میں سامع کی حیثیت سے شریک ہو جاتا اور دوسری خوش قسمتی یہ کہ ان کے دفتر میں ان کی اجازت سے مناسب وقت میں استفادہ کے لیے حاضر ہو جاتا، اور جب شیخ جامعہ کی مرکزی لائبریری میں مطالعہ کے لیے کبھی تشریف لے جاتے تو ایک خادم کی حیثیت سے بعض دفعہ احقر کو ان کے ساتھ لائبریری جانے کا موقع بھی مل جاتا، جہاں شیخ کے لیے مطلوبہ کتابوں کو تلاش کرنے کی سعادت مجھے نصیب ہوتی اور ان سے سیکھنے اور استفادہ کرنے کا خصوصی موقع مل جاتا، یہ سلسلہ تقریباً دو سال (۱۴۰۸ھ-۱۴۰۹ھ) تک جاری رہا، اس دوران حضرت شیخ ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ کو قریب سے دیکھنے اور ان کے علمی و عملی کمالات مشاہدہ کرنے کا موقع ملا، ان کی علمی خصوصیتوں اور سیرت و کردار کی بلندیوں کا مفصل تذکرہ نہ تو میرے بس میں ہے اور نہ ہی اس مختصر مضمون میں ان تمام خوبیوں کو سمویا جا سکتا ہے، تاہم اپنے قلبِ حزیں کی تسکین اور قارئین کے

فائدے کے لیے ان کے علمی و عملی کمالات کے چند نمونے سپردِ قلم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

علومِ دینیّہ کے سچّے متلاشی

حضرت علاّمہ شیخ عبد الفتاح ابو غُدّہ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک ایک سچّے طلبگارِ علم رہے، انہوں نے علمی ذخائر اور اہلِ علم کی تلاش میں اپنے ملک شام کے علاوہ حجاز، مصر، عراق، یمن، سوڈان، المغرب، ترکیہ، ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک کے دورے کیے اور بڑے بڑے اہلِ علم و اصحابِ تحقیق سے صرف استفادہ نہیں کیا، بلکہ ان کے علوم وتحقیقات کو اپنے اندر جذب کرلیا اور وہاں کے بڑے بڑے کتب خانوں اور لائبریریوں سے خوب استفادہ کیا، اور پھر مسلسل کتب بینی، تدریس وتعلیم اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے اور علم وتحقیق کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود ان کی علمی پیاس نے کبھی بجھنے کا نام نہیں لیا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی علمی پیاس میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا رہا تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ذیل میں ان کی زندگی کے مختلف واقعات میں سے صرف چار ایسے واقعات نمونے کے طور پر درج کیے جارہے ہیں، جن سے طلبِ علم کے لیے ان کی محنت، علمی وسائل تلاش کرنے کے لیے ان کی قربانی اور اس راستے میں ان کی جفاکشی کا ایک اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

پہلا واقعہ

جب حضرت شیخ ابوغُدّہ ''کلیة الشریعة جامع ازھر'' کے طالب علم تھے، اس زمانے میں ان کے محترم استاذ حضرت علاّمہ محمد زاہد کوثری حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی: ۱۳۷۱ھ) نے ان کو ملاّ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''فتح باب العنایة بشرح کتاب النُّقایة'' پڑھنے اور اپنے پاس رکھنے کی تاکید فرمائی تھی، کتاب چونکہ نایاب ہوگئی تھی، اس لیے شیخ ابوغُدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تلاش میں طویل محنت اور دعائیں کیں، بالآخر ایک نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اپنی منفرد تحقیق کے ساتھ اس کی پہلی جلد شائع کردی، دوسری جلد کا کام جاری تھا کہ شیخ کا انتقال ہوا اور اب ان کے ہونہار صاحبزادے شیخ سلمان ابوغدّہ حفظہٗ اللہ اس کی تکمیل میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ شیخ عبد الفتاح ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحقیق کے مقدمہ میں مذکورہ ناپید کتاب تک پہنچنے کا جو عبرت انگیز واقعہ ذکر کیا ہے، اس کا ترجمہ ومفہوم پیش کیا جارہا ہے:

''جب میں ''کلیة الشریعة - جامع ازھر'' کا طالب علم اور قاہرہ میں مقیم تھا تو ہمارے استاذ حضرت علاّمہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی وابستگی رہی، اس دوران انہوں نے ایک دفعہ مجھے تاکید فرمائی تھی کہ میں علاّمہ ملاّ علی قاریؒ کی کتاب ''فتح باب العنایة بشرح کتاب النقایة'' کو تلاش کرکے اپنے پاس استفادہ کے لیے رکھوں، میرے استاذ کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ میں نایاب اور مفید کتابوں کا دلدادہ ہوں، اس لیے مجھے مذکورہ کتاب تلاش کرنے کا حکم دیا، میرا خیال یہ تھا کہ مذکورہ

کتاب ہندوستان کی چھپی ہوئی ہوگی، اور قاہرہ میں چھ سال قیام کے دوران برابر اس کو تلاش کرتا رہا اور اپنی تعلیم کی تکمیل تک جس کتب خانہ میں بھی کچھ اندازہ ہوجاتا کہ شاید یہاں پر موجود ہو، وہاں اُسے ڈھونڈتا رہا، لیکن اس کا کوئی اتا پتا نہیں چل سکا۔

اور جب قاہرہ سے اپنے وطن حلَب لوٹا تو جس شہر میں بھی جانا ہوتا یا جس کتب خانہ کی زیارت ہوتی میں برابر مذکورہ کتاب کو تلاش کرتا اور چونکہ مذکورہ کتاب کا تعلّق فقہ حنفی سے تھا، اس لیے میرا خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی چھپی ہوئی ہوگی اور کتاب فروشوں سے اس امید پر ہندوستان کی چھپی ہوئی فقہ حنفی کی عام کتابوں سے متعلق پوچھتا رہتا کہ ہوسکتا ہے اپنی مطلوبہ کتاب ان کے ضمن میں مل سکے، اس لیے کہ بعض مرتبہ کتاب فروشوں کو کتاب کا نام یاد نہیں رہتا، اور دمشق کے کتاب فروشوں میں سے کچھ پرانے حضرات ایسے بھی تھے جو پرانی اور عمدہ کتابوں سے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے اور خود ان کے پاس بھی ایسی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ موجود تھا، البتہ ان کو بیچنے میں سختی سے کام لیتے تھے اور کافی مہنگے داموں فروخت کرتے تھے، اُن حضرات میں سے سیّد عزّت القُصَیْباتی اور ان کے والد، اور شیخ حمدی السَّفَرْجَلاَنی اور سید احمد عُبید بھی تھے۔

میں نے سید عزّت القُصَیْباتی سے ''فتح باب العناية'' سے متعلق یہ کہہ کر دریافت کیا کہ ہندوستان کی چھپی ہوئی کتاب ہے، انہوں نے کہا کہ ہاں! میرے پاس موجود ہے اور مذکورہ کتاب کے بجائے علاّمہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''البناية بشرح الهداية'' جو چھ ضخیم جلدوں میں تقریباً سو سال پہلے ۱۲۹۳ھ کی چھپی ہوئی تھی، نکال کر پیش کردی۔ میں نے اس کتاب کا نام اگرچہ نہیں لیا تھا، تاہم یہ بھی ان نایاب اور عمدہ کتابوں میں سے ایک تھی جن کو میں تلاش کررہا تھا، لہٰذا میں نے مناسب قیمت پر یہ کتاب ان سے خرید لی اور انہوں نے زیادہ قیمت اس لیے وصول نہیں کی کہ میں نے اس کتاب کا نام تو نہیں لیا تھا۔ پھر میں نے شیخ حَمدی السَّفَرْجلانی رحمۃ اللہ علیہ سے کتاب کے بارہ میں معلوم کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ روس کے ایک شہر قزان کی چھپی ہوئی ہے اور کبریتِ احمر سے زیادہ ناپید ہے، اور اپنی پوری زندگی اور کتابوں کے مشغلہ سے وابستہ ہونے کے دور میں صرف ایک نسخہ میرے ہاتھ آیا تھا جو میں نے علاّمہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کو اتنے اونچے داموں بیچا کہ تصور سے بالاتر ہے، ان کی اس بات سے یہ تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ کس شہر کی چھپی ہوئی کتاب ہے، البتہ ساتھ ساتھ اس کے دستیاب ہونے کی امید بھی کمزور ہوگئی۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ۱۳۷۶ھ کو پہلی بار اپنے بیتِ کریم کے حج کا موقع نصیب فرمایا اور میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو اس امید پر وہاں کے کتب خانوں میں مذکورہ کتاب کو تلاش کرتا رہا کہ شاید روس سے بلد اللہ الحرام کی طرف ہجرت کرنے والوں کے ساتھ یہ کتاب بھی پہنچ گئی ہو، لیکن مجھے کامیابی نہ مل سکی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عنایت نے مکہ مکرمہ کے چند معمولی بازاروں میں سے ایک بازار کے اندر ایک گوشہ

نشین بزرگ کتب فروش تک مجھے پہنچایا جن کا نام تھا شیخ مصطفیٰ بن محمد شنقیطی سلّمہ اللہ تعالیٰ، میں نے ان سے کچھ کتابیں خرید لیں اور نا امیدی کی کیفیت میں میری مطلوبہ کتاب کے بارہ میں بھی ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ: تقریباً ایک ہفتہ پہلے میرے پاس اس کا ایک نسخہ آیا تھا جو میں نے علماء بخارا میں سے ایک شخص کے ترکہ سے خریدا تھا اور پھر تاشقند کے ایک عالم کو اچھی خاصی قیمت پر بیچ دیا، مجھے پورا یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ میری مطلوبہ کتاب ہوگی، لیکن جب انہوں نے کتاب کی پوری کیفیت بیان کی تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی کتاب ہے جس کے حصول کے لیے میں چکّر پر چکّر کاٹ رہا ہوں اور عرصہ سے اس کی تلاش میں ہوں۔

میں نے ان سے کہا کہ وہ تاشقندی عالم کون تھے جنہوں نے کتاب خریدی؟ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بتانے لگے کہ ان کا نام شیخ عنایت اللہ تاشقندی تھا، میں نے کہا کہ ان کی رہائش گاہ یا کام کرنے کی جگہ کہاں ہے؟ کہنے لگے: مجھے مزید کچھ بھی پتہ نہیں، میں نے کہا کہ میں انہیں کیسے تلاش کروں گا؟ انہوں نے کہا کہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس صورتحال سے کتاب یا اس کے خریدار ملنے کی ناامیدی میں اضافہ ہوا، لیکن پھر بھی میں جس بخاری شخص کو مسجدِ حرام یا مکہ کے بازاروں میں دیکھتا اس سے شیخ عنایت اللہ کا پوچھتا، اور جن مدارس یا رباطات سے متعلق مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں بخاری حضرات قیام پذیر ہیں وہاں جا کر مذکورہ بخاری شیخ کو تلاش کرتا، یہاں تک کہ مکّہ سے باہر جو محلّے واقع تھے اور مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں پر بخاری حضرات رہتے ہیں' وہاں بھی جا کر پوچھتا، لیکن مطلوبہ شخص کا ملنا دشوار تر ہوگیا، اگرچہ مکہ مکرمہ میں عنایت اللہ نام کے بہت سارے دوسرے حضرات رہتے تھے۔

میری مسلسل تلاش نے آخر میں مجھے شیخ عبدالقادر تاشقندی بخاری ساعاتی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچایا جو مکّہ کے کنارے میں واقع محلّہ جَرْوَل میں قیام پذیر تھے، میں نے ان سے مطلوبہ تاشقندی شیخ کے بارہ میں معلوم کیا تو انہوں نے ان کو پہچانا اور ان کا صحیح نام ''شیخ میر عنایت تاشقندی'' بتایا، لیکن ان کی قیام گاہ یا ملنے کی جگہ سے چونکہ وہ لاعلم تھے اس لیے مجھ پر ایک مایوسی کی کیفیت چھا گئی اور جس شیخ کے پاس سے ''فتح باب العناية'' ملنے کی توقع کی جارہی تھی، ان سے ملاقات کی، امید بظاہر دم توڑ گئی! اس کے بعد میں نے کعبہ معظّمہ زادہا اللہ تشریفاً وتعظیماً کے اردگرد طواف کے دوران اللہ تعالیٰ سے یہ مانگنا شروع کیا کہ مجھے اس مطلوبہ شخص سے ملادیں اور میرے لیے اس کتاب کا حصول آسان فرمادیں، اور دعا مانگنے کا یہ سلسلہ ایک ہفتہ تک برابر جاری رکھا اور اللہ جانتا ہے کہ میرا یہ ہفتہ اس کیفیت میں گزرا کہ میرا دل مذکورہ کتاب اور اس کے مالک کی تلاش میں پریشان تھا۔

مذکورہ کیفیت کے ساتھ میں ایک دن بازار ''بابِ زیادۃ'' میں چل رہا تھا (بابِ زیادۃ مسجدِ حرام کی توسیع سے پہلے اس کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کا نام تھا) اس دوران مکہ مکرمہ کے ایک پرانے دمشقی تاجر نے مجھے دیکھا جن کو ابوعَرَب کہا جاتا تھا اور مکہ مکرمہ میں ان کی تجارت گاہ تھی، انہوں نے مجھے

شامی ہیئت ولباس میں دیکھ کر اپنے یہاں بلایا اور شام اور شام والوں کے احوال معلوم کرنے لگے، میں نے اپنی مطلوبہ کتاب سے شدّتِ محبت کے تحت ان سے مذکورہ بخاری شیخ کے بارہ میں پوچھا، حالانکہ یہ تو خود دمشقی تاجر تھے! انہوں نے کہا کہ سامنے والی دکان ان کے داماد کی ہے اور وہ سب سے زیادہ ان سے واقف ہیں، اللہ کی قسم! میں زیادہ خوشی کی وجہ سے ان کی تصدیق نہیں کر پارہا تھا۔

بہرصورت! میں ان کے داماد کے پاس گیا اور ان سے شیخ عنایت کا پوچھا، وہ حیران ہوکر کہنے لگے کہ: ان کو تلاش کرنے اور ان سے ملنے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آ گئی؟ میں نے کہا کہ مکہ مکرمہ میں میرا ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا کہ میں ان کو برابر ڈھونڈ رہا ہوں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں، آپ اس سلسلہ میں میری راہنمائی کیجئے، انہوں نے ''حيّ المسفلة'' میں واقع ان کی رہائش گاہ کی پوری نشاندہی کردی جو کہ ''قهوة السقيفة'' کے بغل میں واقع تھی، میں بار بار دن رات ان کے گھر جاتا رہا، یہاں تک کہ ان سے ملاقات ہوگئی اور وہ اپنی من پسند قیمت پر کتاب دینے کے لیے آمادہ ہوگئے، پس یہ میری زندگی کی خوشیوں میں سے ایک اہم خوشی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب کی جلد اول کی تحقیق واشاعت کی توفیق عطا فرمادی، اور اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ اپنے فضل وکرم سے باقی حصہ کی اشاعت کی توفیق بھی عنایت فرمادیں۔'' (مقدمہ تحقیق فتح باب العنایۃ، ص:۸-۹۔ صَفَحات من صبر العلماء، ص:۲۷۹-۲۸۱)

دوسرا واقعہ

علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:۱۳۵۲ھ) کی کتاب ''التصريح بما تو اتر في نزول المسيح'' کی تلاش تھی! کتاب چونکہ نایاب ہوگئی تھی، شیخ نے اس کی تلاش پندرہ سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رکھی، آخر میں ایک نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور پھر اپنی منفرد تحقیق کے ساتھ اس کو شائع کردیا۔ شیخ نے تحقیق کے مقدمہ میں مذکورہ کتاب کو تلاش کرنے کا جو واقعہ لکھا ہے، اس کا مفہوم اردو زبان میں پیش کیا جارہا ہے:

''جو کتاب میں نذرِ قارئین کررہا ہوں وہ میری زندگی کی قیمتی تمنا تھی، لیکن اس کا حصول میرے لیے کافی مشکل ہوگیا تھا، اس کا صرف ایک نسخہ حاصل کرنے کے لیے میں نے پندرہ سال سے زیادہ عرصہ تک تلاش جاری رکھی، لیکن پھر بھی کامیابی نہ مل سکی، کتابوں کے شہر ''مصر'' میں چھ سال قیام کے دوران وہاں کے کتب خانوں میں برابر اس کو ڈھونڈتا رہا، اس کے بعد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں اس کی تلاش جاری رکھی، لیکن پھر بھی نہ مل سکی، پھر ہندوستان و پاکستان کے بعض بڑے اہل علم سے درخواست کی کہ یہ کتاب چونکہ ہندوستان کی چھپی ہوئی ہے، اس لیے آپ حضرات اس کا ایک نسخہ تلاش فرمالیں! میں اس بات پر تو ان کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے کتاب کو تلاش کرنے کی کافی کوشش کی، البتہ وہ پھر بھی دستیاب نہ ہوسکی، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کتاب اپنے موضوع کے

اعتبار سے منفرد اور پھر ایک جلیل القدر شخصیت کی تالیف تھی، اس لیے جیسے ہی ۱۳۴۴ھ کو پہلی بار دہلی میں شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ ختم ہوگئی اور بعد میں اس کا ایک نسخہ بھی ملنا مشکل ہوگیا۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ہندوستان و پاکستان کے سفر کا موقع عنایت فرمایا اور وہاں کے کتب خانوں کی زیارت نصیب ہوئی تو میں نے وہاں پر بھی اس کی بڑی تلاش کی، لیکن کامیابی نہیں ملی، البتہ جب میں ہندوستان و پاکستان کے اس سفر کی آخری فرودگاہ کراچی پہنچا اور ہمارے جلیل القدر استاذ، محقق کامل، مفتی اعظم علاّمہ محمد شفیع صاحب بانی دارالعلوم کراچی کی زیارت کا موقع ملا تو میرے اوپر ان کے احسانات میں سے ایک خصوصی احسان یہ رہا کہ انہوں نے اس کتاب کا اپنا مخصوص نسخہ ایک معزّز و نایاب ہدیہ کے طور پر مجھے عنایت فرمایا، یہ علمی ہدیہ میری واپسی سے صرف ایک دن قبل بروز ہفتہ ۷/ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۲ھ کو انہوں نے اس امید کے ساتھ مجھے عنایت فرمایا کہ یہ کتاب بلادِ عرب میں شائع ہوجائے، میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اور اس ہدیہ کی تعریف وقدردانی کرتے ہوئے اسے قبول کیا، البتہ اتنی فرصت نہیں تھی کہ میں اس کی ورق گردانی کروں، اس لیے کہ اگلے دن بروز اتوار ۸/ جمادی الاولیٰ کو صبح سویرے مجھے سفر کرنا تھا اور تیاری میں لگا ہوا تھا، لہٰذا یہ ارادہ کیا کہ ''سوریہ'' جاتے ہوئے ہوائی جہاز کے اندر اس کو رفیقِ سفر بناؤں گا۔

صبح جب میں اپنے ملک واپسی کے لیے کراچی ایئرپورٹ پہنچا تو وہاں پر اہلِ علم وفضل کی ایک جماعت کو موجود پایا جو اس عاجز و ناتواں کو اکرام کے ساتھ رخصت کرنے اور اس کو اپنی آخری اور قیمتی ملاقات سے نوازنے کے لیے جمع تھی، جہاز اُڑنے کے مقرّرہ وقت سے کچھ پہلے اعلان ہوا کہ جہاز دو گھنٹے لیٹ ہے تو میں نے ان علمائے کرام سے درخواست کی کہ آپ حضرات اپنی مصروفیات کی انجام دہی کے لیے واپس تشریف لے جائیں، لیکن انہوں نے احقر کو رخصت کرنے اور مزید عنایت سے نوازنے کے لیے آخری لمحہ تک انتظار کرنے پر اصرار فرمایا، چونکہ یہ مہلت کا ایک بہترین موقع تھا، اس لیے ہم ایئرپورٹ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے، اور چونکہ ان علمائے کرام کے ساتھ ان کے شاگردوں اور مخلصین کا بھی ایک جمِ غفیر موجود تھا، اس لیے ہماری اس الوداعی ملاقات نے ایک بڑی علمی مجلس کی صورت اختیار کرلی، جس میں چیدہ چیدہ علمائے کرام شریک تھے، ان علمائے کرام میں سرفہرست ہمارے جلیل القدر استاذ مولانا علاّمہ محمد شفیع صاحب اور ہمارے بے مثال وکرم فرما استاذ مولانا علاّمہ محمد یوسف بنوری صاحب بانی مدرسہ اسلامیہ کراچی اور اسی مدرسہ کے جلیل القدر مدرّس مولانا علاّمہ لطف اللہ صاحب اور مدرسہ دارالعلوم کراچی کے ناظم مولانا علاّمہ نور احمد صاحب اور دیگر اہلِ علم تھے، جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔

میں نے چاہا کہ بہتر یہ ہوگا کہ فرصت کے ان لمحات کو قیمتی بنا کر ماہ تابِ علم وکمال حضرات سے

استفادہ کرنے میں خرچ کیا جائے، اس مقصد کے تحت میں نے مذکورہ کتاب ''**التصریح بماتو اتر فی نزول المسیح**'' نکال کر ان علمائے کرام سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اس کے ایک حصہ کی عبارت آپ کے سامنے پڑھنا چاہتا ہوں! انہوں نے میری اس خواہش کو سراہا، پھر میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ مجھے عبارت پڑھنے سے پہلے اس کتاب کی اجازت مرحمت فرمائیں! انہوں نے خوشی کے ساتھ اجازت مرحمت فرمادی۔ میں نے حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کا پورا مقدمہ اور کتاب کی تین حدیثیں پڑھیں، پھر ہمارے استاذ مجمع الفضائل والعلوم حضرت علامہ محمد یوسف بنوری حفظہٗ اللہ تعالیٰ نے مزید پانچ حدیثیں پڑھیں اور اس دوران علمائے کرام کے درمیان علمی نکات پر تبادلۂ خیال بھی کیا جاتا رہا۔

جب میری روانگی کا وقت قریب ہوا تو میں نے اس وقت وہ دوشعر سنا دیئے جو دولتِ عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام اور ہمارے استاذ شیخ مصطفیٰ صبری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے مصر سے اپنے ملک واپسی کے لیے رخصت کرتے وقت سنائے تھے:

قالتُ ومدَّتُ یداً نحوی تُو دِّعُنی — ولَوْعةُ البَیْنِ تأبی أن تمدَّ یداً
أَ میّتٌ أنْتَ أمْ حیٌّ؟ فقلتُ لها — من لم یمت یومَ بَیْنٍ لم یمت أبداً

ترجمہ ومفہوم

''اس نے رخصت لینے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیئے، لیکن جدائی کا غم مجھے ہاتھ بڑھانے سے منع کر رہا تھا، کہنے لگی کہ: کیا تو مردہ ہے یا زندہ؟ میں نے جواب میں کہا کہ: جو جدائی کے دن بھی نہیں مرا، وہ پھر کبھی نہیں مرتا۔''

اس پر ہمارے استاذ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے مندرجہ ذیل دوشعر سنائے (جن میں فراق کے زمانہ میں ایامِ وصال کو یاد کرنے اور ان پر غمگین ہوکر رونے اور رُلانے کا تذکرہ ہے)

تذکَّرَ عهداً بالحِمیٰ ثمّ معهداً — جریٰ فیه من دَورِ الکؤوس تَسَلْسُلُ
بَکَیْنا فأَبْکَینا ولامثلَ ناقفٍ — لحنظلةٍ فِی الحیّ حین تحمّلُوا

اس دوران حضرت بنوریؒ اور میری حالت (رونے کی کیفیت میں) مندرجہ ذیل شعر کے مطابق رہی:

ویَبْکِیُ فأَ بْکِیُ رحمةً لبکائهِ — إِذا ما بکَی دمعاً بکیتُ لهٗ دماً

ترجمہ ومفہوم

''وہ رو رہا ہے تو میں بھی اس کے رونے پر رحم کھاتے ہوئے روتا ہوں، جب وہ آنسو بہاتا ہے تو میں اس کے لیے خون کا آنسو بہانے لگتا ہوں۔''

اس کے بعد رخصت اور جدائی کا وقت آیا اور میرے دل میں یہ پکا ارادہ تھا کہ اپنے شیخ

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کی اس تمنا پر لبیک کہوں گا کہ یہ عظیم کتاب شائع ہونی چاہیے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و مدد سے سالِ رواں ۱۳۸۵ھ کو مذکورہ کتاب کی تحقیق و خدمت کا ایسا موقع عنایت فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ اس سے اہلِ علم کی آنکھیں ٹھنڈی اور ایمان والوں کے قلوب منور ہوں گے، اور درست عقیدہ والوں اور سچّے مسلمانوں کے اذہان بصیرت حاصل کریں گے، اور یہ بھی امید ہے کہ میں نے اس کتاب میں جو محنت وصبر و باریک بینی سے کام لیا ہے، وہ اس اللہ کے یہاں میرے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا جو احسانات بکھیرنے والا اور عطایا بخشنے والا ہے، اور جو پڑھنے والے اس کتاب میں کوئی فائدہ محسوس فرمائیں گے ان سے امید کرتا ہوں کہ مجھے ایسی نیک دعا میں یاد فرمالیں جس پر فرشتے آمین کہیں اور دعا کرنے والے کو بھی برابر کا ثواب ملے۔'' (مقدمۂ تحقیق ''التصریح بما تو اتر فی نزول المسیحؑ''، ص۳-۵)

تیسرا واقعہ

حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۸۲ھ کو جب علمائے کرام اور دینی مراکز کی زیارت کے لیے ہندوستان و پاکستان کا دورہ کیا، اس دوران جامعہ اشرفیہ لاہور بھی تشریف لے گئے، اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور دیگر علمائے کرام سے ملاقاتیں کیں، ان ملاقاتوں کے دوران شیخ نے جو علمی فوائد حاصل کرلیے ان میں سے نمونہ کے طور پر صرف ایک مختصر علمی نکتہ جو انہوں نے حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا آگے قلمبند کیا جارہا ہے، تاکہ یہ اندازہ ہوجائے کہ شیخ علمی فوائد کے کتنے دلدادہ اور قدردان تھے! اُس علمی نکتہ کا تذکرہ خود شیخ کی زبانی سنئے:

''حضرت مولانا ادریس کاندھلوی نے اس ملاقات کے دوران یہ بتایا کہ انہوں نے اپنے استاذ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ انہوں نے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شہادت فی سبیل اللہ کی آرزو پر گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی تمنّائے شہادت تو کبھی پوری نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ''سیف اللہ'' کے لقب سے نوازا تھا اور اللہ کی تلوار کو نہ کوئی توڑ سکتا ہے اور نہ ہی سیف اللہ کو کوئی قتل کرسکتا ہے، لہٰذا ان کی شہادت کی آرزو پوری نہ ہوسکی۔ میں نے اپنے استاذ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی حفظہٗ اللہ سے عرض کیا کہ میرے سفر کی قیمت اس ایک علمی نکتہ کے ذریعہ وصول ہوگئی، اس لیے کہ صرف یہی ایک علمی نکتہ ایک مستقل سفر کا حق دار ہے۔''

(حاشیۃ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، ص:۲۱۲)

چوتھا واقعہ

حضرت شیخ عبدالفتّاح ابوغُدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مایۂ ناز کتاب ''صَفَحاتٌ من صبر العلماء''

میں زمانۂ طالب علمی کا اپنا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ وہ ابتداء ہی سے طلبِ علم کی خاطر کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے، واقعہ کا اُردو ترجمہ ومفہوم پیش کیا جارہا ہے:

''میں بھی عام طلبہ کی طرح طالب علمی کے زمانہ میں تنگدستی کا شکار رہا، تاہم اپنے معمولی خرچہ میں سے کچھ نہ کچھ بچا کر حسبِ استطاعت نقد یا ادھار پر کتابیں خرید لیتا، ایک دن کچھ ایسی نایاب واہم کتابیں میرے سامنے فروخت کے لیے پیش ہوئیں جنہیں میں اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا، لیکن زیادہ تنگدستی کی وجہ سے خریدنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا! جس کی وجہ سے میں تشویش میں مبتلا ہوگیا، پھر میں نے اُون کی بنی ہوئی اپنی ایک خوبصورت چادر جو مجھے اپنے والد سے وراثت میں ملی تھی ''**سوق الحراج**'' (ایک بازار کا نام ہے) میں بیچ کر مذکورہ کتابیں خرید لیں اور اپنے دل کو مطمئن کردیا، ان کتابوں کے خریدنے اور اپنے پاس رکھنے سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ الحمد للہ! وہ قیمتی چادر پھر یاد بھی نہیں رہی۔'' (صَفَحات من صبر العلماء، ص: ۲۷۸-۲۷۹)

احقر کہتا ہے کہ مذکورہ چار واقعات شیخ عبدالفتاح ابوغُدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی زندگی کے بے شمار حیرت انگیز واقعات میں سے چند ہی ہیں، جو نمونہ کے طور پر پیش کیے گئے ہیں اور جن سے شیخ کے جذبات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے اور ان کے ایسے ہی واقعات و جذبات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مشہور مقولہ کو صرف پڑھا ہی نہیں تھا، بلکہ عملی میدان میں اس کا پورا حق ادا کردیا تھا: ''**العلم لا یُعطیکَ بعضَهُ حتی تعطیهُ کلَّک**'' (علم اپنا ایک حصہ بھی اس وقت تک آپ کو نہیں دیتا جب تک آپ اپنا سب کچھ اس کو نہیں دیتے) اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے ہی جذبات کی بدولت شیخ نے ''**صَفَحات من صبر العلماء علی شدائد العلم والتحصیل**'' اور ''**قیمة الزمن عند العلماء**'' جیسی مقبول ترین کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء ومشائخ سے بے پناہ محبت وعقیدت

شیخ عبدالفتاح ابوغُدّہ رحمۃ اللہ علیہ کو علمائے ہند سے بالعموم اور مشائخ دارالعلوم دیوبند سے بالخصوص بے پناہ محبت وعقیدت تھی، اسی عقیدت کے تحت انہوں نے ۱۳۸۲ھ کو ہندوستان و پاکستان کا ایک طویل سفر کیا جس کا مقصد علمائے کرام سے ملاقاتیں، دینی مراکز کی زیارت اور وہاں کے کتب خانوں اور لائبریریوں سے استفادہ کرنا تھا، مذکورہ طویل سفر کے دوران شیخ نے ''فرنگی محل لکھنؤ'' میں حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۱۳۰۴ھ) کے خاندان کے علماء سے ملاقات کی اور حضرت مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وتالیفات سے متعلق ان سے دقیق معلومات حاصل کیں، اسی طرح حضرت علّامہ ابوالوفاء افغانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی: ۱۳۹۵ھ) رئیس ''مجلسِ احیاءِ معارفِ نعمانیہ حیدرآباد دکن'' کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان سے علمی استفادہ کیا، شیخ نے خود ''**الرفع والتکمیل فی**

الجرح والتعدیل'' کی تحقیق کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس سفر میں تیس ایسے شہروں کی زیارت کی جہاں بڑے اہلِ علم وکمال اور دینی مراکز موجود تھے۔

شیخ ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں ان تیس شہروں میں سے سب سے اہم اور سرفہرست شہر دیوبند اور اس کا دینی مرکز دارالعلوم دیوبند تھا، چنانچہ وہ خصوصی طور پر دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے مشائخ کی زیارت کے لیے دیوبند تشریف لے گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے نظم ونسق اور علمی واصلاحی ماحول کو دیکھ کر بے حد متأثر ہوئے اور اس وقت کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک سبق میں شرکت بھی فرمائی۔ اس موقع پر شیخ نے دارالعلوم کے رجسٹر میں اپنے جن تأثرات کو قلمبند کیا ہے ان میں اس بات کو خاص طور پر اہمیت دی ہے کہ علمائے دیوبند کی اکثر تالیفات جو علوم ومعارف کے خزانے ہیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں اور عالَم عرب ان کے استفادہ سے محروم ہے، لہٰذا میری پرزور گزارش ودرخواست ہے کہ ان کو عربی زبان میں منتقل کردیا جائے۔ حضرت شیخ ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ کے تأثرات کا اردو ترجمہ تاریخ دارالعلوم دیوبند سے نقل کیا جارہا ہے:

''اس عاجز وناتواں راقم سطور کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا فضل وانعام ہے کہ اس نے ہندوستان کے شہروں کی سیاحت وزیارت کا موقع بہم پہنچایا، بالخصوص ان شہروں میں سرفہرست دیوبند اور اس کی دینی درسگاہ ''دارالعلوم'' کا درجہ ہے، جو درحقیقت ہندوستان کا علم وتقویٰ سے بھرپور زندہ قلب، علماء ومؤلفین کا مرکز اور دین ومعرفت کے طلبہ کی آماجگاہ ہے، اس مرکز کی زیارت عمر بھر کی تمناؤں اور لیل ونہار کے خوابوں میں سے ایک خواب وتمنا تھی، خدا کا شکر ہے کہ آج دارالعلوم کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

دور رہتے ہوئے جو کچھ دارالعلوم کے بارے میں سنا تھا، اس کا جو کچھ ذہن میں خاکہ وتصور تھا قریب سے دیکھ کر اس کو اس سے کہیں زیادہ اچھا اور بہتر پایا، اس مقدس ادارے کے گوشے گوشے سے انوارِ علم کا فیضان ہوتا ہے، اس کی درسگاہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تعلیم دی جاتی ہے اور تشنہ کارانِ علم اور طالبانِ رشد وہدایت کے لیے مثالی نظم ونسق، سلیقہ شعاری اور روشن دماغی کے ساتھ اس اسلوب سے احکام دین وشریعت بیان کیے جاتے ہیں، جس میں اہلِ روحانیت کی روحانیت، اور اصحابِ علم وتحقیق کے آثار وفیوض نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ کمالِ فضل واحسان ہے کہ مجھے **مولانا الأجل برکة الأمة ذو الأنفاس الطاهرة سیدی الشیخ المحدث السید فخر الدین أحمد المرادآبادی** کے درسِ حدیث شریف کے کچھ حصہ کی سماعت کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت موصوف نے طلبۂ محبینِ کرام کی درخواست پر احقر کی

رعایت کرتے ہوئے حدیث بنی سلمہ پر عربی میں تقریر فرمائی، جس میں ذکر ہے کہ بنی سلمہ کی خواہش ہوئی کہ وہ اپنے مکانوں کو چھوڑ کر مسجد نبوی کے جوار میں منتقل ہو جائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو ارشاد فرمایا: ''دیارَکم تُکتب لکم آثارُکم ۔''

موصوف کی تقریر بیش بہا موتیوں اور تابناک ستاروں کا مجموعہ اور ''فیض الباری ''اور''عمدة القاری '' کا مصداق تھی، اسی کے ساتھ شیخ موصوف کی طرف سے ان طلبہ کو جو گوش برآواز تھے اپنے خصوصی ارشادات سے نوازنے کا سلسلہ جاری تھا جو ان تلامذہ کے نفوس میں اس طرح سرایت کرتے تھے جس طرح عطر ہوا میں اور پانی زندگی میں کرتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو سنتِ مطہرہ اور اس کے متبعین کی طرف سے جزائے خیر دے اور اس ادارے کو سماحۃ الشیخ صدر المدرسین مولانا العلّامۃ ابراہیم البلیاوی اور مولانا القاری محمد طیّب صاحب جیسے ارکان واساطین، ائمہ اجلہ، بدور الہدیٰ (بدر ہائے ہدایت) اور مصابیح دُجیٰ (شمعہائے ظلمت) کے زیرِ سایہ ہمیشہ پھلتا پھولتا قائم رکھے اور ان بزرگوں کے نفع بخش اوقات اور انفاسِ طاہرہ میں برکت عطا فرمائے۔

ذمہ دارانِ مدرسہ نے میرے ساتھ مزید احسان واکرام یہ کیا کہ احقر کو اپنا خصوصی مہمان بنایا، اس طرح بسہولت علمائے کرام سے علمی استفادے کا موقع ملا، فللّٰہ الحمد ، نیز وہ چیز جس کے لیے آج ہم سب اللہ تعالیٰ کے مرہونِ منت اور احسان مند ہیں، وہ یہ ادارہ ہے جو مع اساتذہ وتلامذہ کے دین کا گھنا سایہ دار درخت، علم وتقویٰ کا مرکز اور جسمِ اسلامی کی بقاء کا ضامن وہ پھیپھڑا ہے جس میں حیاتِ روحانی کے آثار رواں دواں ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس ادارے کی بقا وترقی اور اس کے علماء کے طولِ حیات سے زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے، واللّٰہ یجیب ولا یخیّب رجاءَ الراجین فضلاً منہ وکرماً۔

علم وتقویٰ کے اساطین سے مالا مال اس عظیم الشان ادارے کے علماء عظام کی خدماتِ جلیلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، بلکہ اگر ذرا جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک واجبی حق ہے، جس کا مطالبہ کر رہا ہوں، وہ یہ کہ ان علمائے کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے متفردانہ عقول کے نتائجِ فکر اور بیش بہا علمی فیوض وتحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالم اسلام کے دوسرے علماء کے لیے استفادے کا موقع فراہم کریں، یہ فریضہ ان حضرات پر اس لیے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علمائے محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اُس میں اُس کو وہ نئی متفردانہ تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدار علیہ گہرے علم اور وسیع مطالعہ کے علاوہ تقویٰ وصلاح اور روحانیت ہوتی ہے، اور چونکہ ہندوستان کے علماء وشیوخ کرام نیکی وصلاح اور روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی شرائط پر نہ صرف یہ

کہ پورے اُترتے ہیں، بلکہ سلف صالحین کے صحیح وارث اوران کے نمونے ہیں، اس لیے ان کی کتابیں نئی اور کارآمد چیزوں سے خالی نہیں ہوتیں، وذٰلک **فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء** ، بلکہ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر، مفسرین ومحدثین اور حکماء کے ہاں بھی دستیاب نہیں ہوتیں، لیکن افسوس اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نادر تالیفات میں سے اکثر بلکہ سب کی سب اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، جو گو ہندوستان کی عام اسلامی زبان سہی، لیکن عربی کو کثیر الاستعمال اور علوم اسلام کی خاص زبان ہونے کا جو شرف حاصل ہے، ظاہر ہے کہ وہ اردو کو حاصل نہیں، لہٰذا یہ علوم اور بیش قیمت تحقیقات جو ہمارے برادرانِ اسلام علمائے ہند کا خصوصی حصہ اور کارنامہ ہیں اگر اردو ہی کے قالب میں محبوس رکھی گئیں تو ہم عربی زبان بولنے والوں سے مخفی اور پوشیدہ رہ کر ہماری محرومی کا باعث بنی رہیں گی۔ اس طرح نہ صرف ہمارے ساتھ ناانصافی ہوگی بلکہ علم ودین کے حق کا بھی ایک بہت بڑا نقصان ہوگا، اس لیے فریضۂ معرفت اور امانتِ علم کی ادائیگی کے لیے یہ بات اوّلین واجبات میں سے ہے کہ ان نفیس، شاہکار اور عمدہ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے، تاکہ ان سے وہ آنکھیں روشنی حاصل کریں جو ایسی چیزوں کے لیے بے تاب، تشنہ اور مشتاق ہیں اور جیسا کہ میرا خیال ہے اس اہم ذمّہ داری اور کٹھن فریضہ کی ادائیگی کا کام اسی ادارۂ عامرہ کے افراد کر سکتے ہیں جو علمائے کرام اور طلبۂ نجباء کا گہوارہ وسرچشمہ ہے۔

اس موقع پر جبکہ میں ذمّہ دارانِ ادارہ کے مشفقانہ طرزِ عمل، نوازشاتِ بزرگانہ اور طلبۂ عزیز کے جذباتِ محبّت واخوت کے لیے کلماتِ شکر حیطۂ تحریر میں لا رہا ہوں اپنے مذکورہ بالا حق اور مطالبے کو دُہرانے کی ایک بار پھر پُرامید ہوکر جرأت کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اس لیے کہ اگر ان حضرات نے اس فریضہ کی ادائیگی کی طرف توجہ مبذول فرمائی تو اس طرح جہاں وہ اپنی ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہوں گے، ساتھ ہی ساتھ یہ دین وثقافت کی ایک عظیم الشان خدمت اور قابلِ ذکر کارنامہ ہوگا، کیونکہ یہ علوم دنیا کے تمام مسلمانوں ہی کی مِلک نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان مساوی طور پر اس سے استفادے کے مستحق ہیں، چہ جائیکہ صرف ہندوستان ہی کے مسلمان ان کے اجارہ دار قرار پائیں، اس لیے از بس ضروری ہے کہ اُردو کتابوں کے عربی میں تراجم کیے جائیں، تاکہ ان کی زیادہ سے زیادہ ترویج واشاعت ہو، اور وسیع پیمانے پر ان سے استفادے کے مواقع فراہم کیے جاسکیں۔

مجھے یہ سُن کر کسی حد تک اطمینان اور مسرّت ہوئی کہ یہ اہم مسئلہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے زیرِ غور ہے، اور وہ عن قریب اس اہم بار اور ذمّہ داری کی ادائیگی کے لیے قدم اُٹھانے والی ہے، جو درحقیقت اس ادارے کے علماء کا اور بالخصوص طلبہ کا واجبی فرض ہے، میں اس خوشخبری کے بعد

تمام علمائے اکابر کا ان کے اس مُبارک عزم اور اقدام پر تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کارِ عظیم میں اس کی خصوصی مدد و معاونت ان کے شاملِ حال ہو، تاکہ بسہولت وہ اس فریضے کو مرحلۂ تکمیل تک پہنچا سکیں، باری تعالیٰ کے لیے یہ کوئی دشوار امر نہیں، **وَمَاذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ** اور نہ ہی ان علمائے اماجد کے لیے ان کے پُختہ عزائم کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی ایسا کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ ہے جو نا قابلِ عبور ہو۔'' (تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص:۳۷۴-۳۷۸)

شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بالا تأثرات کا اظہار دارالعلوم دیوبند کی پہلی زیارت کے موقع پر کیا ہے، اس کے بعد بھی وہ کئی بار دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے ہیں اور وہاں کے ماحول میں آج تک ان کو بلند القاب و احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ **(جاری ہے)**